تبصرہ و تعارف

اِشاریہ اُردو ماہنامہ ''سائنس''

مرتّب: ڈاکٹر محمد کاظم
صفحات: ۴۸۰
مطبع: روشان پرنٹرس، دہلی

رسالوں کی اِشاریہ سازی مطالعے کے نقطۂ نظر سے بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ وہ اس طرح کہ سائنسی میدان کے کسی موضوع پر جب کوئی شخص لکھنا چاہتا ہے یا اُس موضوع پر مختصر طور پر ابتدائی معلومات حاصل کرنا چاہتا ہے تو یہ اشاریہ سازی اُس رسالے میں شائع اُس موضوع پر کم وقت میں معلومات یکجا کر دیتی ہے اور یہی اشاریے مصنف یا مضمون نگار کو تحریری کاوش و تفصیل میں جانے کے لیے راستہ دکھاتے ہیں۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ یہ اشاریے رسالہ کی قدر میں اضافہ کرتے ہیں کیوں کہ سائنسی موضوعات پر معلومات حاصل کرنے کے لیے اُن کتابوں کو حاصل کرنا ایک مشکل کام ہے، لیکن فوری طور پر یہ اشاریے ہی مضمون نگار کی تحریری معلومات کو تقویت بخشتے ہیں۔ یہ سائنسی میدان کو بھی آسان بناتے ہیں اور صحیح طور پر رہنمائی کرتے ہے۔

گزشتہ دنوں رسالہ ''سائنس'' کی اشاریہ سازی کی ترتیب اور تیاری پر ڈاکٹر محمد کاظم کی جو کتاب شائع ہوئی ہے بڑی اہمیت کی حامل ہے کیونکہ کسی رسالہ کی اشاریہ سازی کرنا آسان کام نہیں یہ ایک مشکل کام ہے۔ اس کی تیاری کے دوران اطمینان کے ساتھ گہرائی سے سمجھتے ہوئے اسے انجام دینا ہوتا ہے تاکہ کسی طرح کی غلطی نہ ہونے پائے۔ یہ کام ڈاکٹر کاظم نے بڑی کامیابی سے انجام دیا ہے۔

''سائنس'' کا یہ ماہنامہ جس نے اپنی اشاعت کے گزشتہ دنوں پچیس سال پورے کر لیے ہیں یہ کسی رسالے کے لیے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ڈاکٹر محمد اسلم پرویز نے ۱۹۹۴ء میں مقبول سائنس کا معیاری ماہنامہ ''سائنس'' شائع کرنا شروع کیا۔ اس رسالے کے ذریعے اُردو قارئین مقبول سائنس سے واقف ہوئے، اُن کی دلچسپی سائنس میں بڑھی۔ خاص طور پر طالب علم سائنس کے مطالعے کی جانب متوجہ ہوئے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ رسالے کے سائنسی مواد نے اُردو زبان کو سائنسی معلومات سے آراستہ کیا ہے۔ اگر ہم سائنسی اشاریہ کا جائزہ لیں تو یہ کتاب رسالہ ''سائنس'' کے ۲۷۵ شماروں کا جائزہ پیش کرتی ہے۔ جس میں ۱۹۹۴ء سے شروع ہوکر ۲۰۱۶ء تک کے سارے شماروں کے مضامین کے موضوعات اور مصنّفین کی تفصیل پیش کی گئی ہے۔ جسے دو انداز میں ترتیب میں دیا گیا ہے۔ ایک سال اشاعت کی مناسبت سے اور دوسرے حروف تہجّی کے اعتبار سے، اس کا ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ کوئی شخص یا طالب علم شائع ہونے کا سال معلوم نہ ہوتے ہوئے بھی کسی بھی خاص مضمون سے فائدہ اُٹھا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر کاظم نے اس کتابی اشاریے میں مطالعہ کرنے والوں و تحقیق کاروں کی آسانی کے لیے مضمون نگار کی جگہ مضامین کو زیادہ ترجیح دی ہے جس کے ذریعے کسی بھی سائنسی موضوع تک تحقیق کار کی پہنچ آسانی سے ہوجائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ اشاریے میں پہلے سائنسی مضامین کے عنوانات دیے گئے ہیں اس کے بعد مضمون نگار کا نام اور پھر رسالہ کی جلد، شمارہ، مہینہ، اشاعت کا سنہ اور صفحہ نمبر دیا گیا ہے جس سے قاری کو بڑی سہولت ہوتی ہے۔ اشاریہ کی کتاب کی ابتدا میں سب سے پہلے رسالہ سائنس کے اغراض و مقاصد کو دیا گیا ہے۔ ۱۹۹۴ء سے ۲۰۱۵ء تک کی مجلسِ ادارت اور مجلس مشاورت اور سال کی خریداری وغیرہ کو درج کیا گیا ہے۔ رسالہ کے مختلف موضوعات مثلاً سائنس اور اسلام، قرآن اور سائنس، سائنس کلب، سائنس خبرنامہ، سائنس کوئیز، سائنسی اِصطلاحات، سفیرانِ سائنس اور سائنس ڈکشنری جو رسالے کے مستقل کالم ہیں تک ہی قاری محدود نہیں رہ جاتا بلکہ اس کے علاوہ رسالہ میں سائنس کے مختلف میدانوں کے مضامین بھی شائع ہوتے رہے ہیں مثلاً علم طب، علم کیمیا، علم طبیعیات، زراعت اور کمپیوٹر کے علاوہ ماحولیات پر بھی معیاری مواد کو شائع کیا گیا ہے۔ یہاں یہ ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ کتاب میں اشاریہ کے آخر میں میزان کالم میں سائنس سے متعلق شائع کتابوں پر سائنسی ماہرین کے تبصرے بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اس کتاب میں کئی صفحوں پر خالی جگہوں کو معلوماتی مواد سے پُر کیا گیا ہے جو رسالہ میں شائع ہو چکا ہیں۔ یہ اشاریہ تیار کرنے اور عرق ریزی کے لیے بجا طور پر ڈاکٹر محمد کاظم مبارکباد کے مستحق ہیں۔

تبصرہ نگار: محمد خلیل
سائنٹسٹ، H51، ڈاکٹر اقبال لین، بٹلہ ہاؤس، جامعہ نگر، نئی دہلی

دکن دیس کی پیش رو غزلیں

(سولہویں صدی سے اٹھارویں صدی عیسوی تک)

تحقیق و تالیف: اسلم مرزا
صفحات: ۲۸۴، قیمت: ۲۷۵/روپے
ناشر: الانصار پبلی کیشنز، حیدرآباد

یہ بحث ایک عرصے سے جاری ہے کہ اردو زبان اور اردو شاعری کی

ابتدا شمالی ہند سے ہوئی یا جنوبی ہند کے علاقے دکن سے اس کا آغاز ہوا۔ اس سلسلے میں محققین اور ناقدین باقاعدہ دو گروہوں میں تقسیم ہیں اور اپنے اپنے دعووں کے لیے تاریخ ادب سے دلیلیں پیش کرتے ہیں۔ اس مناظرے سے ایک فائدہ تو یہ ہوا کہ اردو زبان اور لسانیات میں تحقیق و تجسس کے نئے نئے در وا ہو گئے۔ جو محققین اس بات کے قائل ہیں کہ اردو زبان اپنے اردو رسم الخط میں شمالی ہند میں پیدا ہوئی تو وہ یہ فیصلہ نہیں کر پائے کہ شمالی ہند کے کس علاقے میں اس کا آغاز ہوا؟ کوئی اس کا نقطۂ آغاز سندھ قرار دیتا ہے تو کوئی اس کا مولد پنجاب کہتا ہے، کوئی اس کا وطن ہریانہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے تو کسی کا کہنا کہ ملتان سے اس کی شروعات ہوئی۔ کچھ ایسے بھی محقق ہیں جو اردو کا پہلا شاعر امیر خسرو کو قرار دیتے ہیں، لیکن یہ تمام دعوے مفروضات پر مبنی ہیں۔ تحقیق سے یہ ثابت ہے کہ جب ولی دکنی دہلی پہنچے تو وہاں کی زبان اردو نہیں بلکہ فارسی تھی۔ تاہم ولی کا جادو کچھ ایسا سر چڑھ کر بولنے لگا کہ اہل دلی رفتہ رفتہ اردو میں مشق سخن کرنے لگے۔ اگرچہ دہلی کے شرفا اور شعرا اس کا اعتراف کرنا گوارا نہیں کرتے کہ ان کا قابل فخر ادبی سرمایہ دراصل دکنی شعرا کی تقلید ہے اس لیے ولی کا مذاق تو بہت اُڑایا گیا مگر یہ اعتراف کرنا پڑا:

خوگر نہیں کچھ یوں ہی ہم ریختہ گوئی کے
معشوق جو تھا اپنا باشندہ دکن کا تھا

یہ میر کا شعر ہے جنھوں نے ولی دکنی کا بہت مذاق اُڑایا تھا۔ اس طرح سے اور بھی شاعروں نے یہ اعتراف کیا کہ شاعری میں انھوں نے ولی دکنی کی تقلید کی۔

ولی ۱۷۰۰ء میں دہلی پہنچے تھے جب کہ ۱۴۲۱ء میں فخر الدین نظامی کی تصنیف ''کدم راؤ پدم راؤ'' اردو شاعری کا پہلا مستند نقش ہے۔ یہ بات زیر نظر کتاب کے مقدمہ میں محقق اور ماہر لسانیات ڈاکٹر اشفاق انجم نے لکھی ہے۔ انھوں نے اس اہم اور معلوماتی مقدمے میں اور بھی کئی ایسی باتیں پوری دلیل اور حوالے کے ساتھ پیش کی ہیں جو ہماری آنکھیں کھول دیتی ہیں۔

اب چند باتیں اس کتاب سے متعلق ہو جائیں۔ اسلم مرزا تحقیق و تالیف کی دنیا میں نہ تو اجنبی ہیں اور نہ ہی غیر معروف وہ ایک معتبر محقق ہیں اور لسانیات پر گہری نگاہ رکھتے ہیں۔ دکنی ادب ان کا خاص میدان ہے۔ انھوں نے پیش گفتار میں لکھا ہے کہ پونے سے شائع ہونے والے سہ ماہی اسباق کے مدیر کی فرمائش پر دکن کے قدیم شعرا کے مختصر کوائف اور ان کی دو دو غزلوں کے ساتھ روانہ کریں تا کہ رسالے میں بطور کالم قسط وار شائع کیا جا سکے۔ اب جو انھوں نے کام شروع کیا تو خود انھیں بھی یقین نہیں تھا کہ قدیم دکن سے اتنے سارے شعرا نکل آئیں گے کہ ان کی تعداد ایک سو سے زائد ہو جائے گی۔ ہم اب تک دکن کے شعرا میں ولی کے علاوہ ملا وجہی، قلی قطب شاہ، سراج اورنگ آبادی، شاہ سلطان ثانی، ابن نشاطی اور چند دیگر کو جانتے تھے، لیکن اسلم مرزا نے ۱۱۷ شعرا کو ہمارے سامنے پیش کر کے ایک بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔

اس کتاب کی اہمیت اور افادیت اس لیے بھی بڑھ جاتی ہے کہ گولکنڈہ اور بیجاپور کے قدیم شعرا کو بھی شامل کیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ مرزا نے ہر غزل کے نیچے ان الفاظ کے آج کی زبان میں متبادل بھی پیش کیے ہیں جنھیں اب ہم اصل زبان میں سمجھ نہیں پائیں گے۔ اس طرح سے یہ قدیم دکنی شعرا کا تذکرہ ہونے کے ساتھ ساتھ دکنی الفاظ کی لغت بھی ہو گئی ہے۔ یہ کتاب اس لحاظ سے بھی مکمل تحقیق ہے کہ مصنف نے اپنی ہر بات کے لیے حوالے بھی درج کیے ہیں۔ حوالے کے سلسلے میں جن کتابوں کے نام دیے گئے ہیں ان کے مصنف، ناشر اور سنہ اشاعت بھی درج کی گئی ہے۔ لہٰذا یہ کتاب ایک طرف عام قارئین کے لیے دلچسپ ہے تو دوسری طرف دکنی زبان و ادب سے متعلق تحقیق و تنقید کہنے والوں کے لیے بھی بے حد کارآمد ہے۔ الانصار پبلی کیشنز نے اسے شائع کر کے اردو قارئین پر احسان کیا ہے۔ آج کے اس دور میں جب محض سند کی حصولیابی کے لیے تحقیق و تنقید کا معیار گر رہا ہے۔ یہ کتاب اردو کے طالب علموں کو سنجیدہ تحقیق کی طرف مائل کرتی ہے۔

تبصرہ نگار: ڈاکٹر معصوم شرقی
آر۔ایل بی لین۔743194 (شمالی کولکاتہ)

ٹنڈے کباب (طنز و مزاح)
مصنف: ڈاکٹر محبوب حسن
صفحات: ۱۵۹، قیمت: ۱۵۰/روپے
ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، کوچہ پنڈت، دہلی

اردو میں طنز و مزاح کی قدیم و طویل روایت رہی ہے۔ اس کے بغیر اردو ادب کا وجود ادھورا ہے، لیکن عصر حاضر میں اس صنف کی سست رفتاری واقعی قابل افسوس ہے۔ یہ ایسی منفرد اور کارآمد صنف ہے، جو قاری کو ہنستے ہنساتے اس کے داخلی امراض کا بھی علاج کرتی ہے، لیکن اس کا فن بے حد مشکل اور پیچیدہ ہے۔ خوش آئند یہ بات ہے کہ ڈاکٹر محبوب حسن نے اپنی تخلیقی سرگرمیوں کی بنا پر اس صنف کو توانائی بخشی ہے۔ شگوفہ، ادب لطیف، ایوان اردو، نیا دور، کتاب نما، ذہن جدید، کسوٹی جدید، گلبن، انقلاب،

راشٹریہ سہارا جیسے ہندو پاک کے معتبر رسائل وروزناموں میں تواتر کے ساتھ شائع ہونے والی ان کی تحریریں اس بات کا ٹھوس ثبوت ہیں۔طنز و مزاح کے علاوہ انھیں ادب اطفال اور تحقیق وتنقید سے بھی خصوصی دلچسپی ہے۔''تتلی رانی''''عصمت چغتائی اور جین آسٹین'' اور''نکات فکشن'' ان کی دیگر ادبی خدمات ہیں،لیکن ان کی بنیادی و کلیدی شناخت ایک طنز ومزاح نگار کی حیثیت سے ہے۔

''ٹنڈے کباب''ڈاکٹر محبوب حسن کی ایک تازہ ترین طنزیہ ومزاحیہ تصنیف ہے۔کتاب کے انتساب سے مصنف کی تخلیقی جدت پسندی جھلکتی ہے۔انھوں نے کتاب کا انتساب ان قارئین کے نام کیا ہے،جنھیں کتابوں سے بے پناہ محبت ہے،لیکن مطالعہ کے لیے وقت نہیں۔علاوہ ازیں مصنف نے یہ نوٹ لکھ کر قاری کو پوری طرح گرفت میں لیا ہے کہ''کسی بھی قسم کے تنازع کی چارہ جوئی عدالت خداوندی میں ہی ممکن ہے''۔کتاب کی ابتدا میں ساغر خیامی کی مزاحیہ نظم''کباب برائے ثواب'' شامل کی گئی ہے،جس سے کتاب کا لطف دوبالا ہوگیا ہے۔کتاب میں کل تیرہ مضامین شامل ہیں، جن میں مصنف نے طنز ومزاح کے اعلیٰ نمونے پیش کیے ہیں۔ڈاکٹر محبوب حسن نے کتاب کا پیش لفظ اعتراف کے نام سے لکھا ہے،جس میں ان کا طنزیہ ومزاحیہ انداز آشکارا ہے۔موصوف نے اعتراف کے تحت لکھا ہے کہ ''کبھی دوشیزائیں مجاز کی شاعری کو تکیے کے نیچے چھپائے اپنی جھیل سی آنکھوں سے آنسو بہاتی تھیں،لیکن اب ان کی آنکھوں کا کاجل کسی اور وجہ سے بھیگتا ہے۔ایک زمانہ تھا جب''کلیات ساحر'' چوری ہوجانے پر بلبل جونپوری کی بیگم صاحبہ عالم غم میں دوپہر سے شام تک بے ہوش رہیں،لیکن افسوس کہ اب کتابوں پر کسی کی نیت خراب نہیں ہوتی''(ص:۱۱)مذکورہ جملوں کے پس پردہ انھوں نے زوال پذیر تہذیبی وسماجی قدروں کو نہایت دلچسپ انداز میں آئینہ دکھایا ہے۔

زیر نظر کتاب کا پہلا مضمون''ٹنڈے کباب کی یاد میں'' ہے،جس میں مصنف نے موجودہ سیاسی بدعنوانیوں اور شکستہ حال ثقافتی قدروں کو طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ٹنڈے کباب کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''سرزمین لکھنؤ پر قدم رکھنا اگر فرض ہے تو ٹنڈے کباب سے لطف اندوز ہونا سنت قرار پاتا ہے۔''(ص:۱۹)اس مضمون کے ذریعہ قاری کو نہ صرف ٹنڈے کباب سے واقفیت حاصل ہوتی ہے بلکہ وہ اس کے ذائقہ اور خوشبو کو بھی محسوس کرلیتا ہے۔کتاب کا دوسرا مضمون''رومیو کی آزمائش'' ہے،جس میں اتر پردیش سرکار کے احمقانہ سیاسی رویوں پر طنز کے نشتر چلائے گئے ہیں۔مصنف کے لفظوں میں''یوپی میں پھولوں کی دکانیں بند ہوتے ہی پتھروں کے بازار سج گئے ہیں۔محبت کی بانسری کی جگہ اُستری کا چلن بڑھ گیا ہے۔نفرت کے سوداگر ہر سو معصوم دلوں پر پتھر پھینکنے کے فراق میں ہیں۔دراصل Anti Romio Squad محبت کے بلبل کو پنجرے میں قید کرنا چاہتی ہے۔پولیس محکمہ اپنی تمام تر ذمہ داریوں سے دست بردار ہوکر رومیو کی تلاش میں گھاٹ گھاٹ کا پانی پی رہا ہے۔''(ص:۲۵)

مضمون''جس جلسہ میں طلبا کو میسر نہ ہو بوٹی''میں مصنف نے ادبی سمیناروں کی بدنظمی و بدعنوانی کو دلچسپ انداز میں طنز کا نشانہ بنایا ہے۔اس تحریر میں سمیناروں میں ہونے والی مضحکہ خیزی کی حقیقی تصویریں نظر آتی ہیں۔ایک دلچسپ منظر کی تصویر کشی کرتے ہوئے لکھا ہے''مجھے تو ادب برائے ادب سے زیادہ ادب برائے بریانی اور ادب برائے قورمہ کا نظریہ زیادہ پسند ہے۔آج کل ہر جگہ اسی نظریہ کی دھوم مچی ہے۔آخر ہماری زندگی کا بنیادی مقصد کھانا پینا ہی تو ہے۔اگر طعام کا معقول انتظام نہ ہو تو سمینار کی جانب جھانکتا کون ہے؟ آپ دیکھتے نہیں کہ سمینار میں لنچ کا اعلان ہوتے ہی کس قدر افراتفری مچتی ہے۔محمود ایاز کی طرح سب کے سب ایک ہی صف میں نظر آتے ہیں۔ہر کسی کے ہاتھ سے صبر کا دامن چھوٹ جاتا ہے۔''(ص:۳۳)یہ مضمون حالات کی ستم ظریفی کو جاندار اور دلچسپ انداز میں پیش کرتا ہے۔گویا سب کچھ قاری کی آنکھوں کے سامنے چل رہا ہو۔

''میرے اللہ پی ایچ ڈی سے بچانا مجھ کو''کے توسط سے ملک میں پھیلی ہوئی بے روزگاری و بیکاری کے عبرت ناک مسئلے کو پیش کرتے ہوئے سماج ومعاشرے کی نظر اس جانب متوجہ کیا ہے کہ کس طرح اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ دربدر کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور ہیں،لیکن ان پڑھ سیاست داں سراپا عیاشی میں ڈوبے ہوئے ہیں۔علی گڑھ مسلم یونیورسٹی جو طلبا کے لیے ایک روحانی مرکز کی حیثیت رکھتی ہے، جہاں لوگ اپنی علمی پیاس بجھانے آتے ہیں، لیکن افسوس کہ یہاں بعض حضرات غیر ضروری چیزوں میں الجھ کر رہ جاتے ہیں۔ڈاکٹر محبوب اپنے مضمون''ڈھائی گھنٹے کا علی گڑھ'' میں اس صورت حال کو بے حد مزاحیہ انداز میں شیروانی اور صدری کی بحث کے ذریعے اپنے طنز کا نشانہ بناتے ہیں۔''مس اردو سے ملاقات'' میں تمثیلی اور مکالماتی پیرایہ میں اردو اور اس کے ساتھ ہونے والی نا انصافی کو اجاگر کیا گیا ہے۔علاوہ ازیں اس مضمون سے اردو کے تئیں موصوف کا محبت آمیز جذبہ بھی عیاں ہے۔بقول مصنف''اردو میری دھڑکنوں میں شامل ہے،میری سانسوں میں تحلیل ہے۔میری محبت کا یہ عالم ہے کہ اردو میری رگوں میں لہو بن کر گردش کر رہی ہے۔''(ص:۷۷)ڈاکٹر محبوب حسن حسب حال اپنا مذاق اڑانے سے بھی نہیں چوکتے۔کتاب کے آخری مضمون''پھرتے ہیں

میر خوار کوئی پوچھتا نہیں'' میں انہوں نے اپنی ذاتی زندگی کے قابل رحم تجربات ومشاہدات کو نہایت دیانت داری کے ساتھ پیش کیا ہے۔ دراصل انھوں نے آپ بیتی کو جگ بیتی کا روپ دے دیا ہے۔ ڈاکٹر محبوب حسن نے بیشتر جگہوں پر جمہوری قدروں کی ناکامی اور نامرادی کو بھی ہدف تنقید بنایا ہے۔ موصوف نے ''ایسی آزادی سے بہتر ہے غلامی یا رب'' میں ملک کی موجودہ صورت اور سیاسی رہنماؤں کی عیاری ومکاری کو بے باکانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ ''رشوت برائے رحمت'' ملک میں پھیلی ہوئی اقتصادی بدعنوانی اور معاشی انتشار کی گھنونی تصویریں طنزیہ پیرائے میں پیش کرتا ہے۔ یہاں ان کا طنز شدید تر ہو گیا ہے۔ مضمون ''اگلے جنم مجھے گئو ماتا نہ کیجیے'' فرقہ پرست طاقتوں کے گال پر زوردار طمانچہ ہے۔

ڈاکٹر محبوب حسن کی کتاب ''ٹنڈے کباب'' میں پیش کردہ موضوعات ومسائل ہماری عصری زندگی سے گہری وابستگی رکھتے ہیں۔ دراصل پیش نظر کتاب عصری فرقہ واریت، سماجی وسیاسی انتشار، اقتصادی وتہذیبی بحران اور زوال پذیر اخلاقی قدروں کا خوبصورت نگار خانہ ہے۔ ان کی طنزیہ و مزاحیہ تحریریں ہمیں مسرت سے بصیرت اور طنز سے تازیانے تک کا سفر کراتی ہیں۔ ان کا اسلوب اور زبان و بیان بھی موضوعات کے عین مطابق ہے۔ موصوف نے عام فہم انداز میں ان مسائل کو جس فکری بصیرت اور جس تخلیقی جدت پسندی کے ساتھ اٹھایا ہے، وہ انھیں ہم عصر تخلیق کاروں میں منفرد وممتاز مقام عطا کرتی ہے۔ ڈاکٹر محبوب حسن اپنی اس تخلیقی کاوش کے لیے مبارک باد کے مستحق ہیں۔ مختصر یہ کہ زیر مطالعہ کتاب ''ٹنڈے کباب'' مختلف ذہنی سطح کے قارئین کے درمیان یکساں طور پر مقبول ہوگی۔ نیز طنز و مزاح کی عصری روایت کے استحکام میں بھی اپنا نمایاں کردار ادا کرے گی۔

تبصرہ نگار: فیاض حمید

ریسرچ اسکالر، شعبہ اردو، ڈاکٹر ہری سنگھ گور سنٹرل یونیورسٹی، مدھیہ پردیش

بہار کی یونیورسٹیوں میں اُردو زبان کی توسیع میں
اساتذہ کی خدمات (**تحقیق و تنقید**)
مصنف: ڈاکٹر احمد صغیر
صفحات: ۳۸۴، قیمت: ۳۵۰/روپے
ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔110006

صوبۂ بہار تو یوں تو کئی معنوں میں پورے ہندوستان میں امتیاز و افتخار حاصل ہے۔ اسی صوبے نے قدیم ہندوستان کو جمہوریت کا درس دیا۔ اسی سرزمین پر قدیم ہندوستان کی عظیم حکومتیں قائم ودائم تھیں۔ اسی خطّے میں قدیم ہندوستان کی اعلیٰ درجے کی درس گاہیں موجود تھیں۔ دنیا کے دو بڑے مذاہب (بدھ اور جین مذہب) بھی اسی سرزمین میں پیدا ہوئے۔ اس علاقے کی جتنی تعریف وتوصیف کی جائے کم ہے۔ جدید دور میں بھی اس صوبے کی افادیت واہمیت کم نہیں ہوئی ہے۔ پٹنہ کی مشہور ''خدا بخش لائبریری'' بھی ہندوستان ہی نہیں بلکہ عالمی سطح پر اپنا منفرد مقام رکھتی ہے۔ درس وتدریس کے میدان میں اس زرخیز خطۂ ارض نے بڑے قدآور اساتذہ کو پیدا کیا۔ خاص کر اُردو اساتذہ نے اس صوبے اور ہندوستان کا نام اُردو ادب کے ساتھ ساتھ عالمی سطح پر روشن کیا۔ یہ ایک لمبی ادبی کہکشاں ہے جو ختم ہونے کا نام نہیں لیتی۔ جن اساتذہ یا محققین ونا قدین نے صوبۂ بہار کے نام کو عروج، وقار اور افتخار عطا کیا ان میں پروفیسر عبدالغفار شہباز، اختر اورینوی، حسن عسکری، عبدالمنان بیدل، امداد امام اثر، قاضی عبدالودود، پروفیسر اختر قادری، مطیع الرحمٰن، ڈاکٹر ممتاز احمد خاں، پروفیسر طلحہ رضوی برق، پروفیسر علیم اللہ حالی برق،، پروفیسر حفیظ بنارسی، پروفیسر ظفر اوگانوی، پروفیسر افصح ظفر، پرو فیسر وہاب اشرفی، پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی، پروفیسر صدرالدین فضا، اقبال حسن، پروفیسر کلیم عاجز، کلیم الدین احمد، پروفیسر عبدالمغنی، پروفیسر شکیل الرحمٰن اور پروفیسر تاج انور کے اسما قابل اعتبار واعتماد ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب ''بہار کی یونیورسٹیوں میں اُردو زبان وادب کی توسیع وترقی میں اساتذہ کی خدمات (تحقیق وتنقید)'' ڈاکٹر احمد صغیر (مشہور فلکشن نگار اور گیا کے انوگرا میموریل ڈگری کالج میں اُردو کے استاد) کا ایسا ادبی، تحقیقی وتنقیدی دستاویز ہے، جس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ موصوف نے جس عرق ریزی، گہرائی، گیرائی، انہماک اور جاں فشانی سے اس کتاب کو مکمل کیا ہے وہ قابلِ تعریف وستائش ہے۔ دراصل یہ تحقیقی پروجیکٹ قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان، نئی دہلی کے مالی تعاون سے مکمل کیا۔ ڈاکٹر احمد صغیر نے اس کتاب کا انتساب ''اُن اساتذہ کے نام جنھوں نے کئی نام ور قلم کار پیدا کیے'' کے نام موسوم کیا ہے۔ موصوف نے اس تحقیقی وتنقیدی کتاب کو آٹھ (۸) عنوانات میں تقسیم کیا ہے۔

پہلا باب ''پٹنہ یونیورسٹی ایک تعارف'' کے نام سے قائم کیا گیا ہے۔ اس میں پٹنہ یونیورسٹی کی تاریخی اہمیت و افادیت کے ساتھ اس ادارے کے شعبۂ اُردو سے وابستہ اساتذۂ کرام کی اُردو زبان وادب کے فروغ میں دی گئی خدمات کو منصۂ شہود پر لانے کی سعی کی ہے۔ باب میں جن اساتذہ کی فہرست اور قلمی خاکہ پیش کیا گیا ہے اُن کی تعداد ۲۵ ہے۔ جن میں اختر اورینوی، ممتاز احمد، کلیم عاجز، اسلم آزاد، اسرائیل رضا، کلیم الدین احمد، عبدالمغنی اور نذر امام کے نام فہرست میں شامل کئے گئے

ہیں۔باب کے آخر میں پٹنہ یونیورسٹی سے فارغ التحصیل اُن ۱۹۸ طلبا کی فہرست دی گئی ہے جنھوں نے اس ادارے سے تحقیقی مقالے سپردقلم کیے ہیں یا کرنے جارہے ہیں۔

دوسرا باب ''بھیم راؤ امبیڈ کر یونیورسٹی :بہار یونیورسٹی –ایک تعارف'' کے عنوان سے لکھا گیا ہے۔اس باب میں اس درس گاہ کے قیام اوراس کے اغراض و مقاصد پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔ساتھ ہی اس یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو کی کارکردگی کا طائرانہ جائزہ بھی لیا گیا ہے۔شعبۂ اُردو سے وابستہ جن ۱۲۰ اساتذہ کا قلمی خاکہ ڈاکٹر احمد صغیر نے کھینچا ہے ان میں عبدالماجد اختر،عبدالواسع ،شکیل الرحمٰن،شمیم احمد،توقیر عالم،نعم کوثر،ممتاز احمد خاں کے نام قابل ذکر ہیں۔اس یونیورسٹی کے تحت لکھے گئے تحقیقی مقالوں کی فہرست (۳۴۸ وہ تحقیقی مقالے جن پر ڈگریاں تفویض ہوچکی ہیں اور ۳۲ مقالے وہ جن پر تحقیقی کام ہورہا ہے) بھی ساتھ میں منسلک ہے۔

تیسرا باب ''مگدھ یونیورسٹی، بودھ گیا۔ایک تعارف'' کے نام سے لکھا گیا ہے۔اس باب میں اس یونیورسٹی کی تاریخی اہمیت،شناخت اوراس کے قیام کے مقصد پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔ساتھ ہی یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو کی خدمات کا بھی اجمالی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔شعبہ میں جن ۱۹۷ اساتذہ نے خدمات انجام دیں ان کی فہرست کے علاوہ یونیورسٹی سطح پر کئے گئے ۲۴۵ تحقیقی مقالات کی فہرست بھی باب کے آخر میں دی گئی ہے۔

چوتھے باب ''للت نارائن متھلا یونیورسٹی–ایک تعارف'' کے عنوان سے رقم کیا گیا ہے۔اس باب کے تحت اس یونیورسٹی کے قیام کا مقصد اور شعبۂ اُردو سے وابستہ ۱۲۰ اساتذہ کے اسما کی فہرست اوران کے قلمی خاکے قابل دید ہیں۔باب کے اختتام پر ۲۱ ریسرچ اسکالرس کے نام کی نامکمل فہرست دی گئی ہے۔

پانچویں باب کے تحت ''تلکا مانجھی بھاگلپور یونیورسٹی–ایک تعارف'' کے عنوان سے اس یونیورسٹی کے قیام کے اغراض ومقاصد اور شعبۂ اُردو کی کارکردگی کو صفحۂ قرطاس پر بیان کیا گیا ہے۔جن اساتذہ نے اس ادارے کے شعبۂ اُردو میں خدمات انجام دیں یا خدمت انجام دے رہے ہیں،ان کی تعداد ۱۱ بتائی گئی ہے۔ان کے بھی قلمی خاکے سلیقگی کے ساتھ قاری کے سامنے رکھے گئے ہیں۔۶۱ طلبا کی ایک فہرست بھی دی گئی ہے جنھوں نے اس یونیورسٹی کے تحت تحقیقی مقالے تحریر کیے۔

چھٹا باب ''ویر کنور سنگھ یونیورسٹی–ایک تعارف'' کے نام سے لکھا گیا ہے۔یونیورسٹی کا قیام ،تاریخی پس منظر اور شعبۂ اُردو سے منسلک رہے ۱۹ اساتذہ کے اسما اوران کے قلمی خاکے تحریر کیے گئے ہیں۔جن ۱۶ طلبا نے اس یونیورسٹی کے تحت تحقیقی مقالے سپردقلم کیے ان کے اسما بھی باب کے آخر میں دیے گئے ہیں۔

ساتواں باب ''جے پرکاش نارائن یونیورسٹی –ایک تعارف'' کے تحت لکھا گیا ہے۔اس یونیورسٹی کے مختصر تعارف کے ساتھ اس کے علمی و ادبی کارناموں اور شعبۂ اُردو میں درس وتدریس کی خدمات انجام دینے والے ۱۱۱ اساتذہ کے اسما،ان کے قلمی خاکے ڈاکٹر احمد صغیر نے پیش کیے ہیں۔اس یونیورسٹی کے تحقیقی مقالوں کی فہرست منسلک نہیں کی گئی ہے۔

آخری اور آٹھواں باب ''بی۔این۔منڈل یونیورسٹی–ایک تعارف'' کے عنوان سے رقم کیا گیا ہے۔یونیورسٹی کے مختصر تعارف کے ساتھ ۱۱۰ اساتذہ کے اسما اوران کا مختصر قلمی خاکہ بھی پیش کیا گیا ہے۔ساتھ ہی اُن ۴۳ ریسرچ اسکالرس کی فہرست بھی دی گئی ہے جنھوں نے اس یونیورسٹی کے تحت مقالے رقم کیے ہیں۔

المختصر! یہ کتاب بہار کے ادبی افق پر ایک نئے دور کے آغاز کی غماز ہے۔ڈاکٹر احمد صغیر نے اس تحقیقی کام کو وسیع مطالعے،سخت محنت اور لگن کے ساتھ انجام دیا ہے۔پیش لفظ کے مطابق اس پروجیکٹ کے شروع میں جو سوال نامے اساتذہ کو بھیجے گئے تھے اس میں سے صرف اور صرف ڈھائی فی صدی نے ہی انھیں پُر کیا۔خیر! یہ ادبی اور علمی کارنامہ اکیلے شخص کی کاوش اور جہت کا نتیجہ ہے۔اس ادبی دستاویز کے منظرِ عام پر آنے سے بہار ہی نہیں بلکہ ملک اور بیرونِ ملک کے طلبا اور اساتذہ کو تحقیق کے میدان میں یہ فائدہ ہوگا کہ ان کے پاس تحقیقی موضوعات کی فہرست ہوگی اور تحقیقی مقالات کے عنوانات وموضوعات کا انتخاب کرتے وقت مماثلت اور یکسانیت سے بچا جاسکے گا اور نئے تحقیقی عنوان پر مقالے لکھے جاسکیں گے۔

تبصرہ نگار: ابراہیم افسر

وارڈ نمبر 1، مہپا چوراہا، نگر پنچایت، سیول خاص، ضلع میرٹھ (یو پی)

نورِ لازوال

شاعر: نور محمد نور کرنیل گنجوی

صفحات: ۲۷۲، قیمت: ۲۰۰/روپے

ناشر: نور محمد نور گنجوی، H-3/8886، آمرپالی یوجنا، ہردوئی، سیتاپور روڈ، لکھنؤ

''نورِ لازوال'' نور محمد نور کرنیل گنجوی کا شعری مجموعہ ہے۔ان کا تعلق کرنیل گنج گونڈہ کے ایک ادب پرور اور دیندار خاندان سے ہے۔انھوں نے شاعری میں استاد الشعرا عبدالستار خاں بیدل مرادآبادی کی سرپرستی پائی۔جو شاعری کے علم وفن کے ساتھ ساتھ کہنہ مشقی اور ریاض کے باعث

ان جیسے سیکڑوں شاعری کی سرپرستی کر رہے ہیں اور منصب استادی پر فائز ہیں۔ پروفیسر ملک زادہ منظور احمد ''حرف چند'' میں اس سے متعلق لکھتے ہیں:

''اس سعادت کے باعث نورؔ صاحب کے کلام میں اگر ایک طرف ماضی کے صنم کدوں کا نور شامل ہے تو دوسری طرف اخلاق و معارف اور انسانیت کی اعلیٰ وارفع قدریں ان کے کلام کو منور کرتی ہیں....''

دوسرے مضمون میں نور صاحب کے استاد بیدلؔ مرادآبادی نے ان کی شعری خوبیوں کو بیان کیا ہے۔ کتاب میں مختلف اصناف کے اشعار شامل ہیں جیسے حمد، نعتیں، غزلیں، قطعات، متفرق اشعار کے علاوہ 'نیا سال مبارک'، سہرا، کرشن ورادھا کی بانی اور عید ملن جیسے موضوعات پر نظمیں موجود ہیں۔

اس شعری مجموعہ کی شروعات حمدِ باری تعالیٰ سے ہوتی ہے۔ مثلاً:

آپس کی نفرت کو مٹا دے یا اللہ
بچھڑے ہوئے ہر دل کو ملادے یا اللہ

انسان میں انسان کو محبت پیدا کر
اُلفت سے ہر دل کو سجادے یا اللہ

ان اشعار میں نورؔ صاحب ایک مصلح قوم کا کردار نبھاتے ہوئے نظر آرہے ہیں اور جس میں وہ خدا سے انسانوں کے بیچ ہو رہی آپسی رنجشوں اور نفرتوں کو دور کرنے کی دُعا کر رہے ہیں۔

نورؔ صاحب نے حسن و عشق، ناز و نیاز، ہجر و وصال اور شوق و انتظار کے ساتھ ساتھ ہماری پرانی شاعری میں اعلیٰ و ارفع قدروں کی ترجمانی کرنے کے ساتھ ساتھ اس مقدس ترکہ کو نئی نسل تک منتقل کرنے کی پوری کوشش کی ہے، جن میں غالبؔ اور میرؔ کا اثر صاف جھلکتا ہے۔ مثلاً:

کیوں کہوں سب سے مدعا کیا ہے
مہرباں کم مرا خدا کیا ہے
ملا نہ کچھ بھی ہمیں گرد اور تھکن کے سوا
سویرے نکلے تھے اور سارا دن گزار آئے

ان موضوعات کے علاوہ ان کی شاعری میں ہمیں ماں کی محبت اور بیٹی کا دُلار بھی چھلکتا نظر آتا ہے۔ مثلاً یہ اشعار:

عمر بھر ہو نہیں سکتا ہے ادا دودھ کا قرض
حق کسی سے بھی ادا ماں کا کہاں ہوتا ہے
کرکے وضو نماز میں جب بیٹھتی ہیں وہ
جنت کی حور لگتی ہیں وہ بیٹیاں مجھے

نورؔ صاحب کے اس شعری مجموعے میں اصلاحِ قوم اور دین کی خدمت کا جذبہ بھی نظر آتا ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے۔

خواہشوں کا دائرہ کم کیجیے
زندگی کٹ جائے گی آرام سے

نور صاحب کی شاعری میں ایک طرف اخلاقی پہلو ہے تو دوسری طرف وہ ہمیں اس دنیا کی حقیقت سے روبرو کراتے ہیں:

دہر میں رکھنا کسی سے نہ وفا کی اُمید
دورِ حاضر میں کہاں لوگ وفا کرتے ہیں
بچانے میں لگا ہوں میں نئی تہذیب کے شر سے
کہ دیرینہ روایت نکلی جاتی ہے مرے گھر سے

انھوں نے ہر ایک موضوع کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے، جن میں بھوک، مفلسی، تہذیب و تمدن، رشتے ناتے اور دنیا کی بے ثباتی کو پیش کیا ہے:

دو روٹیاں ہوسکے تو دے دیجیے مجھے
للہ میرا دین دھرم کچھ نہ پوچھئے
روشنی کا خیال رکھئے گا
گھر کا جب بوڑھا چاند ڈھل جائے

مجموعے کے آخر میں نورؔ صاحب نے چار نظمیں شامل کی ہیں جن کے عنوان (۱) نیا سال مبارک (۲) سہرا (۳) کرشن ورادھا کی بانی اور عید ملن ہیں۔ چاروں ہی نظمیں اپنے عنوانات کی طرح دلکش اور سادہ زبان میں پیش کی گئی ہیں۔

بہرحال اس شعری مجموعے کو پڑھنے کے بعد ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ نورؔ صاحب نے غزل کی روایت کو برقرار رکھنے کی پوری کوشش کی ہے اور ساتھ ہی ساتھ اپنے عہد میں شعر و ادب کی بلندیوں میں بیش قیمت اضافے کرنے کی بھرپور کاوش کی ہے۔ اُمید ہے اردو شاعری سے محبت رکھنے والوں کو یہ مجموعۂ کلام اپنی جانب ضرور متوجہ کرے گا۔

تبصرہ نگار: گلشن
ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی۔ 110007

ضروری تصحیح

'ایوانِ اردو' جولائی ۲۰۱۸ء میں شائع پہلا تبصرہ سیدہ شانِ معراج کی کتاب 'زنجیر در' کا ہے۔ قارئین کتاب کا نام درست فرمالیں۔ شکریہ
(ادارہ)